



فکراقبال کے تاریخی و تہذیبی تصورات

HISTORICAL AND CULTURAL CONCEPTS OF IQBAL'S THOUGHTS

Dr. Uzma Noreen

uzma.noreen@gcwus.edu.pk

Lecturer, Urdu Department, G.C Women University, Sialkot, Pakistan.

Abstract

History and civilization are of fundamental importance in the thought of Allama Muhammad Iqbal. Iqbal does not consider history to be merely a collection of past events, but rather a mirror of the life, rise and fall, and intellectual evolution of nations. According to him, nations that maintain a connection with their history and cultural heritage achieve progress and stability. According to Iqbal, history is the name of human struggle, action, and change. He considers the history of Muslims to be a source of greatness, character building, and spiritual strength. His poetry repeatedly mentions the brilliant characters and events of Islamic history. Historical characters like Tariq bin Ziyad, Salahuddin Ayubi, and Muhammad bin Qasim are symbols of action, courage, and self-sacrifice for Iqbal. Iqbal believes that the decline of nations begins when they begin to neglect their history. That is why he gives the message to Muslims to learn from their glorious past and build the future. Iqbal considers civilization to be a manifestation of the spiritual, moral, and intellectual development of man. According to him, the foundation of Islamic civilization is based on monotheism, brotherhood, equality, and justice. He values the scientific progress and intellectual achievements of Western civilization, but also criticizes its materialism, nationalism, and spiritual vacuum. According to Iqbal, a healthy civilization is one that maintains spiritual and moral values along with material progress. He supports a civilization in which the human personality can develop and society is based on justice and fairness. Iqbal considers Islamic civilization to be a living, dynamic, and universal civilization. In his opinion, Islam gave humanity a message of unity by eliminating the distinctions of race, color, and geography. He considers Islamic civilization not a legacy of the past but a source of guidance for the future. Iqbal believes in a balance between the spirituality of the East and the scientific progress of the West. According to him, the West achieved material progress but moved away from spiritual values, while the East, despite possessing spiritual capital, weakened in the practical field. He considers the combination of the positive aspects of both to be essential for the well-being of humanity.

Keywords: Action, Allama Muhammad Iqbal, Change, Dynamic, East and West, Human Struggle, Islamic Civilization, Muhammad Bin Qasim, Salahuddin Ayubi, Universal Civilization.

Corresponding Author: Dr. Uzma Noreen (Lecturer, Urdu Department, G.C Women University, Sialkot, Pakistan)
Email: uzma.noreen@gcwus.edu.pk

علامہ اقبال کے کئی فکری زاویے ہیں جن کے مطابق، فکر و دانش کا ہر وہ چراغ جو جذبہٴ درونِ قلب کی تپش سے محروم ہو، وہ محض ایک بے روح فکری نمائش گاہ بن کر رہ جاتا ہے۔ ان کے نزدیک دانائی کو جب تک وارداتِ قلبی اور سچی تڑپ کا سہارا نہ ملے، وہ مابعدالطبیعیاتی الجھنوں اور بے سمت فلسفیانہ تصورات کے علاوہ کچھ پیدا نہیں کرتی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ برصغیر کے قدیم مابعدالطبیعیاتی افکار کا گہرا تجزیہ کرتے ہوئے اس بنیادی معمے کی نشان دہی کرتے ہیں کہ کس طرح وہ ازلی و ابدی حقیقتِ واحدہ، اپنی یگانگت اور منفرد مرکزیت کو ٹھیس پہنچائے بغیر، اس کائنات کے رنگا رنگ اور لامتناہی مظاہر میں جلوہ گر ہوئی۔ یعنی کثرت کے اس ہجوم میں بھی وہ واحد بستی اپنی انفرادی شانِ یکتائی کو برقرار رکھنے کی جستجو میں رہی۔ اقبال اس کائناتی سچائی اور ابدی جذبے کو اپنی لازوال اور شہرہٴ آفاق نظم "مسجدِ قرطبہ" میں ایک اچھوتی جہت دیتے ہیں، جہاں وہ عشق کو زماں و مکاں کی قید سے آزاد ایک ایسی ہمہ گیر اور لازمانی قوت کے طور پر پیش کرتے ہیں جو فنا کے دھارے کو روکنے کی سکت رکھتی ہے اور جس کی قلمرو میں وقت کا زوال اور حدود کے تمام بندھن ہیچ ہو جاتے ہیں۔ نظم "مسجدِ قرطبہ" میں اقبال نے عشق کی ہمہ گیر اور لازمانی وسعت کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا۔

عشق کی تقویم میں عصر رواں کے سوا

اور زمانے بھی ہیں جن کا نہیں کوئی نام (۱)

یعنی فلسفے کی اعلیٰ ترین سطح پر پہنچ کر جذبہ، تخلیقی اظہار اور دانش کا ہر دھارا ایک دوسرے میں ضم ہو جاتے ہیں، اور یوں شعر و فکر حقیقتِ ابدی کے سانچے میں ڈھل کر 'عشق' کا متبادل بن جاتے ہیں۔ علامہ اقبال کے کلام کی اساس یہی کائناتی یکتائی ہے، جہاں لفظ اور شعور الگ نہیں رہتے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ہم ان جیسی زماں و مکاں سے ماورا اور لامتناہی فکر رکھنے والی بستی کی آفاقیت پر غور کرتے ہیں، تو یہ سوال ناگزیر ہو جاتا ہے کہ کیا ان کے پیغام کو محض ان کے اپنے دور کے مخصوص حالات کے فریم ورک میں قید کر دینا، ان کی ہمہ گیر اور یزداں گیر سوچ کی توہین نہیں ہوگی؟ سچی بات یہ ہے کہ اقبال کی دُور رس نگاہ جہاں ایک طرف ماورائی، الوہی اور مابعدالطبیعیاتی بلندیوں کو چھوتی ہے، وہیں دوسری طرف وہ اپنے عہد کی نبض اور زمینی و

معروضی حقائق سے بھی پوری طرح جڑی ہوئی ہے۔ چنانچہ، ان کی فکر کو موجودہ دور کے تناظر میں پرکھنا یا اس کی عصری اہمیت پر بات کرنا برگز بے محل نہیں ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ آفاقی مابعدالطبیعیاتی جستجو اور اپنے دور کے معاشرتی و سیاسی تموجات کا یہی نادر سنگم اقبال کے فکری وجود کی اصل پہچان ہے۔ ابدیت اور ہنگامیت کا یہی جادوئی ملاپ ان کے پیغام کو جہاں ایک طرف رہتی دنیا تک کے لیے امر (لازمانی) بناتا ہے، وہیں اسے ہر بدلتے ہوئے عہد کے لیے یکساں معتبر اور متحرک (زمانی) بھی رکھتا ہے۔

حکیم الامت اقبال کی فکری پرواز مابعدالطبیعیاتی بلندیوں (معراج) اور زمینی حقائق کی طرف مراجعت کے باہمی امتزاج سے ہی اپنی تکمیل کو پہنچتی ہے۔ وہ ابدیت کے آفاقی اصولوں کے چراغ سے اپنے عہد کے تاریک اور تغیر پذیر سیاسی و سماجی منظر نامے کو منور کرتے ہیں، اور پھر ان گہرے فکری نتائج کو تخلیق کے انتہائی دلنشین اور لطیف سانچوں میں ڈھال دیتے ہیں۔

قدیم ہندوستانی فلسفے کا یہ بنیادی معمہ کہ وہ ازلی و ابدی حقیقتِ واحدہ (احد)، اپنی انفرادی یکتائی کو گنوائے بغیر اس کائنات کے لامتناہی مظاہر (کثرت) میں کیسے جلوہ گر ہوئی، آج محض ایک تجریدی مابعدالطبیعیاتی بحث نہیں رہا۔ بلکہ وقت کے ساتھ یہ سوال آسمان کی ماورائی بلندیوں سے اتر کر ہماری معروضی اور ٹھوس سیاسی و تہذیبی زندگی کا حصہ بن چکا ہے۔ اب یہ ایک بالکل الٹ صورتِ حال میں ہمارے سامنے کھڑا ہے اور ہم سے یہ تقاضا کر رہا ہے کہ کثرت (مختلف افکار، ثقافتیں اور گروہ) اپنی انفرادی شناخت اور تنوع کو برقرار رکھتے ہوئے، ایک مربوط اور ہم آہنگ وحدت میں کیسے تبدیل ہو سکتی ہے۔ اگر گہرائی سے دیکھا جائے، تو عصرِ حاضر کے سیاسی اور تہذیبی بحرانوں کا یہ سب سے بڑا اور ناگزیر ترین سوال ہے۔

معاصر عالمی منظر نامے پر ڈالے جانے والی ایک سرسری نگاہ ہی اس المناک سچائی کو آشکار کرنے کے لیے کافی ہے کہ موجودہ انسانی تہذیب کس قدر بولناک اور سنگین بحران سے دوچار ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے زمین اور سمندر کا گوشہ گوشہ فساد اور بگاڑ کی لپیٹ میں آکر پوری نوعِ انسانی کے بقا کے لیے ایک مہیب خطرہ بن چکا ہے۔ بالخصوص سرد جنگ کے اختتام کے بعد سے ایک نئے جارحانہ غلبے کی لہر اٹھی ہے اور ایک مخصوص عالمی نظام کا ڈھول پیٹا جا رہا ہے، جس کی پشت پر مغرب اور امریکہ کا شدید مروجہ احساسِ برتری اور حد سے بڑھا ہوا استکبار (تکبر) کارفرما ہے۔

اسی سامراجی ذہنیت کی عکاسی امریکی دانشور فرانسس فوکویاما کی تصنیف "The End of History and the Last Man" کرتی ہے، جس میں لیبرل جمہوریت کو انسانی ارتقا کی آخری اور حتمی منزل قرار دیا گیا ہے۔ اسی فکر کے شانہ بشانہ ایک اور امریکی مفکر سیموئیل پی ہنٹنگٹن کا نظریہ بھی سامنے آیا ہے۔ ساموئیل ہنٹنگٹن کی شہرہ آفاق تصنیف "The Clash of Civilizations and the Remaking of World Order" (تہذیبوں کا تصادم اور عالمی نظام کی نو تشکیل) عصر حاضر کی بین الاقوامی سیاست کو سمجھنے کے لیے ایک انتہائی اہم اور فکر انگیز دستاویز ہے۔ مصنف کا بنیادی استدلال یہ ہے کہ سرد جنگ کے خاتمے کے بعد نئی دنیا میں ریاستوں کے درمیان تصادم کی بنیادی وجہ نہ تو نظریاتی ہوگی اور نہ ہی معاشی، بلکہ اب نوع انسانی میں تقسیم اور نزاع کی سب سے بڑی لکیر تہذیب اور ثقافت کی بنیاد پر کھینچے گی۔ ان کے نزدیک یہی گہرے ثقافتی تفاوت اور موروثی جڑیں مستقبل میں بھی عالمی سطح پر مستقلاً مستقل تفریق اور بڑے ٹکراؤ کا اصل منبع بنی رہیں گی۔

ہنٹنگٹن کا خیال ہے کہ سوویت یونین کے زوال اور "آہنی پردے" (Iron Curtain) کے تار تار ہو جانے کے بعد دنیا کا روایتی سیاسی ڈھانچہ یکسر بدل چکا ہے۔ چونکہ اب یورپ کو طویل عرصے تک تقسیم رکھنے والی نظریاتی خلیج باقی نہیں رہی، اس لیے اب ایک نیا منظر نامہ ابھر رہا ہے جہاں ایک طرف مغربی عیسائیت ہے، تو دوسری جانب قدامت پسند ٹھیٹھ عیسائیت (Orthodox Christianity) اور عالم اسلام کی موروثی ثقافتی سرحدیں آمنے سامنے آ رہی ہیں۔ تہذیبی کھنچاؤ کے اسی وسیع تناظر میں سابق چینی رہنما ڈینگ ژیاؤ پنگ کا وہ دور اندیشانہ احساس بھی غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔

موجودہ دور میں معاشی، نظریاتی اور ثقافتی بنیادوں پر قائم تفریق اور تہذیبی انتشار کے اس پریشان کن ماحول میں علامہ اقبال کی فکر ہمارے لیے ایک جامع مشعلِ راہ ہے۔ اقبال کا فلسفہ اس مادی اور تہذیبی تصادم کا حل مشرق کی روحانیت اور مغرب کی سائنسی و مادی ترقی کے متوازن ملاپ میں پیش کرتا ہے۔ وہ تنگ نظر جغرافیائی قومیت کی نفی کرتے ہوئے ایک ایسے عالمگیر انسانی شعور کی دعوت دیتے ہیں جو رنگ، نسل اور سرحدوں کے امتیاز سے بالاتر ہو۔ مزید برآں، ان کا 'تصورِ خودی' مغلوب تہذیبوں کو احساس کمتری سے نکال کر اپنی شناخت برقرار رکھنے کا حوصلہ دیتا ہے، جبکہ ان کا 'نظریہ اجتہاد' فکری جمود کو توڑ کر بدلتے حالات کے ساتھ آگے بڑھنے کا درس دیتا ہے۔ یوں اقبال کی فکر ہمیں تصادم اور نفرت کے بجائے ایک ایسے آفاقی نظام کی طرف رہنمائی کرتی

ہے جہاں مادی قوت اخلاقی اور انسانی اقدار کے تابع ہو، جو آج کے پر آشوب دور کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔

اقبال نے "ضرب کلیم" میں "امامت" کے زیر عنوان نظم میں لکھا تھا۔
"تو نے پوچھی ہے امامت کی حقیقت مجھ سے

حق تجھے میری طرح صاحب اسرار کرے
ہے وہی تیرے زمانے کا امام برحق
جو تجھے حاضر و موجود سے بیزار کرے
موت کے آئینے میں تجھ کو دکھا کر رخ دوست
زندگی تیرے لیے اور بھی دشوار کرے
دے کے احساس زیاں تیرا لہو گرمادے
فقر کی سان چڑھا کر تجھے تلوار کرے" (۲)

علامہ اقبال کی اپنے عصر اور حاضر و موجود سے بیزاری کی بنیادی وجہ وہ ابدیت بیزار، مادہ پرست اور روح کش نظریات تھے جنہوں نے انسانیت کو فکری اور اخلاقی فساد میں مبتلا کر رکھا تھا، اور یہی باطل تصورات آج بھی ہماری دنیا کو جہنم بنائے ہوئے ہیں۔ اقبال کی مثنوی 'بندگی نامہ' کا ابتدائی ڈرامائی منظر اسی المیے کی عکاسی کرتا ہے، جہاں چاند خدا کے حضور زمین کے باسیوں کا شکوہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اشرف المخلوقات کہلانے والا انسان اپنی 'خودی' اور روحانیت کو فراموش کر کے مادی قوتوں اور جابر آقاؤں کی غلامی میں جکڑا ہوا ہے۔ چاند کا یہ نوحہ دراصل خود اقبال کے دل کی وہ تڑپ ہے جو انسان کو مادی مغلوبیت، نقالی اور ابدیت سے بیزاری کے اندھیروں سے نکال کر دوبارہ حقیقی بندگی، غیرت اور آزادی کے آفاقی نور سے روشناس کرانا چاہتی ہے۔

"دنیا کو روشن کرنے والے چاند نے اللہ سے کہا: میری دودھیا روشنی رات کو دن بنا دیتی ہے مجھے وہ دن یاد آتے ہیں جب دن اور رات کا قصہ ہی نہ تھا اور میں زمانے کے ضمیر میں سویا ہوا تھا۔ میرے اندرون سپاہ میں ایک بھی روشن ستارہ نہ تھا۔ میری نہاد گردش سے عاری تھی۔ نہ میرے نور سے دشت و در آئینہ پوش تھے نہ سمندر میں میرے جمال سے جوار بھاٹا کی کیفیت پیدا ہوتی تھی۔ پھر ایک دن میں نے آفتاب سے روشن ہونے کا فن سیکھا اور یوں اس مردہ خاکداں کو حیات تازہ بخشی۔ مگر افسوس یہ خاکداں روشن تو ہے لیکن اسے اطمینان نصیب نہیں۔ اس کا چہرہ غلامی سے داغ داغ ہے۔ اس کا آدم مچھلی کی طرح کانٹا نگلے ہوئے ہے۔ آدم جو یزداں کش ہے اور آپ اپنا پجاری ہے۔ اے خدا

تو نے جب مجھے آب و گل کی زنجیر پہنائی ہے، اس کے طواف سے مجھے خجل کیا ہے۔ یہ جہاں یہ خاکداں نور جاں سے آگاہ نہیں۔ یہ جہاں چاند اور سورج کے شایاں نہیں۔ اے خدا تو نیلگوں فضا میں اسے تنہا چھوڑ دے اور ہم نوریوں کا رشتہ اس سے منقطع کر لے۔ یا تو مجھے اس کی خدمت سے نجات دے یا اس کی خاک سے آدم ثانی کا ظہور فرما۔" (۳)

علامہ اقبال محض اس دنیا کے خاموش تماشائی نہیں تھے، بلکہ وہ اپنے عہد میں ایک گہرا فکری اور روحانی انقلاب لانا چاہتے تھے۔ ان کے تمام شعری و نثری کارناموں کا اصل مقصد یہی تھا کہ ان کا دور روحانیت، آزادی اور آزادیِ اظہارِ رائے کو اپنا بنیادی اصول بنائے۔ اگر موجودہ نظام اور معاشرہ ان اعلیٰ قدروں کو اپنانے میں ناکام رہے، تو وہ اس پرانی دنیا کی جگہ ایک بالکل نئے انسان اور نئے نظام کے ظہور کے خواہاں تھے۔ اقبال کی اپنے دور سے گہری وابستگی اور عالمگیر سوچ کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ان کے اردو اور فارسی کلام میں لفظ "جہاں" یا اس کے مترادفات ساڑھے چھ سو سے زیادہ مرتبہ استعمال ہوئے ہیں، جو ان کی وسیع اور آفاقی فکر کی عکاسی کرتا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

"جہاں تازہ کی افکار تازہ سے بے نمو

کہ سنگ وحشت سے بوتے نہیں جہاں پیدا

وہی جہاں ہے ترا جس کو تو کرے پیدا

یہ سنگ وحشت نہیں جو تری نگاہ میں ہے

قلندریم و کرامات ما جہاں بینی است

زما نگاہ طلب کیمیا چہ می جوئی؟

نگردو زندگانی خستہ ازکار جہانگیری

جہا نے درگرہ بستم جہا نے دیگرے پیش است (۴)

اقبال کا زندگی کے بارے میں پُر امید اور متحرک نظریہ جہاں انہیں ابدی سچائیوں سے جوڑتا ہے، وہاں اپنے دور کے تہذیبی و فکری حالات کا حقیقت پسندانہ تجزیہ کرنے پر بھی ابھارتا ہے۔ وہ دراصل ایک ایسے عالمی مفکر ہیں جن کی فکر رنگ، نسل اور جغرافیائی حدود سے آزاد ہے۔ اپنی وفات سے

کچھ عرصہ قبل نئے سال کے پیغام میں انہوں نے بنی نوع انسان کے لیے جس گہری محبت اور سامراجی نظام سے جس شدید نفرت کا اظہار کیا، وہ ان کے اسی آفاقی رویے کا واضح ثبوت ہے۔ انہوں نے فرمایا ہے کہ۔

"وحدت صرف ایک ہی معتبر ہے اور وہ نوع انسانی کی وحدت ہے جو نسل و زمان و رنگ سے بالاتر ہے۔ جب تک اس نام نہاد جمہوریت، اس ناپاک قوم پرستی اور اس ذلیل ملوکیت کی نعشوں کو پاش پاش نہ کر دیا جائے گا۔ جب تک انسان اپنے عمل کے اعتبار سے الخلق عیال اللہ کے اصول کا قائل نہ ہو جائے گا۔ اس وقت تک انسان اس دنیا میں فلاح و سعادت کی زندگی بسر نہ کر سکیں گے اور "اخوت، حریت اور مساوات کے شاندار الفاظ شرمندہ تعبیر نہ ہوں گے۔" (۵)

اقبال نے جہاں مغرب کی سامراجیت، قوم پرستی اور نسلی تعصب کی مخالفت کی، وہاں انہوں نے مغربی نظریہ علم پر بھی کڑی تنقید کی جو سراسر شک و شبہ پر مبنی ہے۔ اگرچہ اس تشکیک پسند رویے نے انسان کو تسخیرِ فطرت اور کائنات کے راز افشا کرنے میں مدد دی اور اس کا خود اعتمادی کو بڑھایا، لیکن اس کا بڑا نقصان یہ ہوا کہ ابدی اخلاقی اقدار اور ایمان و یقین کی طاقت کمزور پڑ گئی۔ نتیجتاً، معاشرے میں ایک ایسی بدترین بے یقینی نے جنم لیا جسے اقبال غلامی سے بھی زیادہ نقصان دہ سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جدید انسان روحانیت سے دور ہو کر محض مادی دنیا کی تسخیر اور اسی کی پوجا کو اپنی زندگی کا اصل مقصد سمجھ بیٹھا ہے۔ مادہ پرستی کی اس دوڑ میں آج مغرب اور مشرق دونوں بری طرح شریک ہیں اور صورتحال اکبر الہ آبادی کے اس شعر کے مصداق ہے۔

"شوق لیلائے سول سروس نے مجھ مجنون کو

اتنا دوڑایا لنگوٹی کر دیا پتلون کو" (۶)

علامہ اقبال کے نزدیک علم جب تک عشق (جذبہ و جنون) سے محروم رہے، محض بے جان افکار کا تماشا رہتا ہے۔ انہوں نے نہ صرف اپنے دور کے نظریہ علم پر تنقید کی، بلکہ فنونِ لطیفہ کے بارے میں بھی گہری بصیرت پیش کی۔ اقبال کے ان تمام نظریات کے پیچھے ایک متحرک، زندہ اور پُرخلوص ایمانی جذبہ (آتشیں تصور) کارفرما ہے، جو انہیں انبیاء کرام، مشاہیرِ اسلام اور صوفیائے عظام (جیسے رومی و عطار) کے فیضانِ نظر سے حاصل ہوا۔ یہی والہانہ اور پرجوش اندازِ بیان ان کے کلام کی اصل پہچان ہے۔

علامہ اقبال کے کلام اور پیغامات میں ان کے مضبوط ایمان کی روشنی اور قلبی جذبے کی حرارت شامل تھی، اور دنیا میں جہاں کہیں بھی سچائی کا نور ہوگا، وہ اقبال کی بصیرت سے میل کھا جائے گا کیونکہ روشنی کبھی روشنی کی ضد نہیں ہوتی۔ اقبال کی تمام تر شعری، نثری اور عملی جدوجہد کا بنیادی مقصد ایک ایسے مثالی معاشرے کا قیام تھا جو روحانیت سے فیض یاب اور اسلام کے عالمگیر اصولوں پر استوار ہو۔ ایک ایسا سماج جو رنگ، نسل، ذات پات اور طبقاتی تفریق سے پاک ہو، جہاں انسانیت کا احترام قائم ہو اور ایثار و بے غرضی کا دور دورہ ہو۔ اقبال کے نزدیک ان کی فارسی مثنویوں (اسرار و رموز) کا مقصد بھی یہی تھا، جیسا کہ انہوں نے پروفیسر نکلسن کے نام خط میں واضح کیا کہ ان کی شاعری کا اصل مقصد ایک آفاقی معاشرے کی ازسرنو تشکیل ہے۔

مثنوی 'اسرارِ خودی' میں "میرِ نجات نقش بند" کے بھیس میں اقبال نے جو نصائح کی ہیں، ان کے اولین مخاطب اگرچہ برصغیر کے مسلمان ہیں، لیکن ان کی حیثیت آفاقی اور ابدی ہے۔ وہ انسان کو جھنجھوڑتے ہوئے کہتے ہیں کہ تیرا المیہ یہ ہے کہ تو روشنی اور بصیرت کی تلاش میں باہر بھٹک رہا ہے، جبکہ وہ بصیرت خود تیری اپنی آنکھوں میں موجود ہے جس سے تو بے خبر ہے۔ اگر تجھے حقیقی زندگی چاہیے تو تجھے کٹھن چیلنجز کا سامنا کرنا ہوگا، لیکن موجودہ دور کی مادی عقل سے جذبہ و محبت کی امید رکھنا فضول ہے۔ اس مادہ پرستانہ نظام سے معرفتِ الہی کے سرور کی توقع نہیں کی جا سکتی کیونکہ یہ جدید عقل حقیقت کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ یہ ظاہری چیزوں کی پوجا کرتی ہے، خود نئے بت تراشتی ہے اور مادی فائدوں کے قید خانے میں اسیر ہو کر اپنی حسی حدود سے آگے نہیں نکل پاتی۔ یہ عقل زندگی کے سچے راستے سے بھٹک کر خود اپنے ہی ہاتھوں اپنی بقا کو مٹا رہی ہے۔ اس جدید دانش میں چمک دمک تو ہے مگر وہ جذبے کی گرمی سے محروم ایک ٹھنڈی آگ کی مانند ہے، اس کی فطرت عشق کی دولت سے خالی ہے اور اس کے پاس وہ دل ہی نہیں جو راتوں کو خدا کے حضور "یارب، یارب" کی پکار میں تڑپ سکے۔

اقبال نے دانش حاضر کی اس کوتاہ نظری کا ماتم کہاں کہاں نہیں کیا۔ "بال جبریل" میں فرمایا ہے کہ۔
"تازہ پھردانش حاضر نے کیا سحر قدیم"

گزر اس عہد میں ممکن نہیں ہے چوب کلیم" (V)

یہاں ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ جب تک جدید مادی عقل اور اس کے پیدا کردہ طور طریقے، جیسے مادہ پرستی، اقتدار کی بوس، زمین پر قبضے کی جنگ (جوع الارض)، معاشی لوٹ کھسوٹ، سماجی ناہمواری اور دیگر فکری و روحانی خرابیاں انسانی دنیا سے مکمل طور پر ختم نہیں

ہو جاتیں، اور جب تک کائنات کے نقشے سے سچی محبت اور اس کی تڑپ مٹ نہیں جاتی، تب تک اقبال کے فکر و جذبے کی اہمیت اور ضرورت ہمیشہ برقرار رہے گی۔ اردو اور فارسی کا یہ بے نظیر شاعر، اپنے انوکھے افکار کی وادی سے ہمارے بنجر دلوں میں محبت اور جنون کے پھول کھلاتا رہے گا۔ فکر و فلسفے کا یہ رہنما ہمارے لیے ایک نئے عالمی نظام اور ایک مثالی انسان (مردِ مومن) کے ابھار کے خاکے تیار کرتا رہے گا، کیونکہ اس رہبر کے سینے کو بصیرت رکھنے والوں نے ایک ایسا روشن تجلی خانہ بنا دیا تھا جس کی مثال ہماری پچھلی کئی صدیوں کی شاعری میں تلاش کرنے سے بھی نہیں ملتی۔

حوالہ جات

- ۱۔ اقبال، مسجدِ قرطبہ، مشمولہ "بالِ جبریل"، علم و عرفان پبلشرز لاہور۔ ۱۹۹۹ء، ص ۹۸
- ۲۔ اقبال، "امامت" مشمولہ "ضربِ کلیم"، علم و عرفان پبلشرز لاہور۔ ۱۹۹۹ء، ص ۱۳۲
- ۳۔ ڈاکٹر تحسین فراقی، مترجم، "کلیاتِ اقبال (فارسی)"، ص ۲۱۳
- ۴۔ ڈاکٹر تحسین فراقی، مترجم، "کلیاتِ اقبال (فارسی)"، واردو، ص ۷۸
- ۵۔ محمد اقبال، خطوطِ اقبال، جلد دوم، مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۹۹ء، ص ۶۷۷
- ۶۔ اکبر الہ آبادی، کلیات، مرتبہ ڈاکٹر خواجہ محمد ذکریا، فکشن ہاؤس لاہور، ۲۰۰۵ء، ص ۳۵۸
- ۷۔ اقبال، مسجدِ قرطبہ، مشمولہ "بالِ جبریل"، علم و عرفان پبلشرز لاہور۔ ۱۹۹۹ء، ص ۲۷۸